جی چاہتا ہے نقشِ قدم چومتے چلیں

مولانا محمد علی جوہرؒ

خان یاسر

امی، ابّی اور دادا کے نام

جن سے میں نے سیکھا کہ
عظیم شخصیات
آسمان سے نہیں اترتیں
بلکہ
زمین پر پیدا ہوتی ہیں،
زمین سے وابستہ ہوتی ہیں؛
اور یہ کہ
ہر بچہ
اگر ُچاہے'
تو 'بڑا' آدمی بن سکتا ہے...

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

"سنو بھائیو! ہم مہاتما جی اور ان ہندو بھائیوں کے جوان کی سرکردگی میں ہمارے شریک حال ہوئے بے حد ممنون ہیں، لیکن یہ یاد رکھیے کہ اگر مہاتما جی ہمارے ساتھ نہ بھی ہوتے بلکہ یہ کہو کہ پیدا بھی نہ ہوتے تب بھی میں یہی کرتا جو میں نے کیا... ہمارا بھروسہ مہاتما جی پر نہیں ہے، بلکہ خدا پر ہے؛ اور ہر ایک ہندو مسلمان کو صرف خدا ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔... ہم کو چاہیے کہ خدا کی دی ہوئی عقلوں سے کام لیں اور خود سوچیں کہ ہمارے لیے کیا مناسب ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے مناسب ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ شریک ہو کر ہندوستان کو آزاد کرائیں اور ہندوؤں کو مناسب ہے کہ وہ مصر، ترکی، فلسطین، اور حجازی باشندوں کو اپنا سمجھیں اور ان کی آزادی کو اپنی آزادی اور ان کی غلامی کو اپنی غلامی سے غیر متعلق نہ سمجھیں۔ ہم مسلمانوں کو تو فقط ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑنا نہیں ہے، ہم کو تو چومکھی لڑائی لڑنی ہے۔...

بعض لوگ ہیں... جو کہتے ہیں کہ مذہب کو سیاست سے علیحدہ رکھو... یہ لوگ چاہتے ہیں کہ مذہب داتون یا مسواک کے جیسا ہو جائے کہ ایک دوسرے کے داتون یا مسواک کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں؛ مذہب ایک خانگی چیز ہو جائے اور پبلک معاملات سے بالکل سروکار نہ رہے۔ لیکن یہی لوگ ہیں جو اپنے مذہب کے عقیدے کی بنا پر مسلمانوں کو خود ان کی گائے ذبح کرنے سے بھی روکنا چاہتے ہیں۔ مذہب ساری زندگی کی تفصیل ہے اور زندگی کے ہر شعبے سے اس کو تعلق ہے۔ کرنل ریجوڈ نے مجھے پارلیمنٹ مدعو کیا تھا، ہم چائے پی رہے تھے تو انھوں نے فرمایا کہ بھائی تمھارا جو جی چاہے کرو مگر اپنے مذہب کو ہمارے پارلیمنٹ میں نہ لاؤ۔ میں نے کہا کہ میرا مذہب آپ کی پارلیمنٹ تو پارلیمنٹ، آپ کے چکلوں اور شراب خانوں تک میں جائے گا اور وہاں کی گندگیوں کو دور کرے گا۔"[9]

(محمد علی جوہرؔ)

محمد علی جوہر

پیدائش اور بچپن: محمد علی 10 ستمبر 1878 کو رامپور میں پیدا ہوئے۔ ابھی دو سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور تربیت ونگہداشت کی تمام تر ذمہ داری والدہ آبادی بیگم کے کاندھوں پر آن پڑی۔ یہی آبادی بیگم بعد کو 'بی اماں' کے نام سے تاریخ میں مشہور ہوئیں۔ گھر پر ہی ایک مدرس سے تعلیم حاصل کی، اس کے بعد 1888 میں رامپور کے مدرسہ جدیدیہ میں داخلہ لے لیا۔ پھر بریلی گئے، ساتویں جماعت میں ہی تھے کہ علی گڑھ چلے آئے جہاں سے 1898 میں فرسٹ کلاس بی اے کیا۔ گریجویشن کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے آکسفورڈ بھی گئے، مگر یہاں بوجوہ سول سروس کے امتحان میں کامیاب نہ ہوسکے، لہٰذا ہندوستان واپس آکر رامپور میں ہی انسپکٹر آف اسکولس کی ملازمت اختیار کرلی۔ مگر ناکامی کی کسک انھیں پھر آکسفورڈ لے گئی جہاں کے لنکن کالج سے وہ ماڈرن ہسٹری میں بی اے کرآئے۔

واپسی پر بڑودہ اسٹیٹ میں ملازم ہوئے۔ اسی ملازمت کے زمانے میں ٹائمس آف انڈیا میں مضامین لکھنے شروع کیے۔ مولانا میں قائدانہ جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ لہٰذا بریلی کے زمانے میں ہی انھوں نے نچلے درجہ کے طلبہ کی ایک انجمن قائم کرکے اس کی صدارت کے فرائض انجام دیے۔ آکسفورڈ میں بھی نورتن کے نام سے ایک انجمن بناڈالی، جہاں ہندوستانی طلبہ کے مسائل حل کیے جاتے تھے۔ اسی طرح علی گڑھ میں کھیل کے میدان سے لے کر مشاعروں کی 'تجدید' تک ہر میدان میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔ بیگم صاحبہ بھوپال نے اپنی ریاست میں چیف سیکرٹری عہدہ دینا چاہا آپ نے انکار کردیا کہ آپ قوم کی خدمت کرنا چاہتے تھے اور ملازمت کرتے ہوئے یہ ممکن نہ تھا۔

بیباک قلم: مولانا میں صحافت کے 'کیڑے' بچپن سے ہی فعال تھے، چنانچہ 1904 میں ہی انھوں نے گپ کے نام سے ایک پندرہ روزہ نکالنا شروع کیا تھا گو یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔

مولانا نے صحافت کے میدان میں باقاعدہ قدم انگریزی میں رکھا، ٹائمس آف انڈیا کے علاوہ آبزرور اور انڈین ریویو میں بھی مولانا کے متعدد مضامین شائع ہوئے۔ سنجیدہ موضوعات پر بیبا کی سے قلم اٹھانا اور اس کی تمام بنیادی بحثوں کا احاطہ کر کے قارئین کی خدمت میں پروس دینا ان کا ملکہ تھا۔ مولانا محمد علی جوہر ایک کہنہ مشق شاعر بھی تھے، آسان زبان میں مشکل سے مشکل فلسفے کو بلاغت کی اعلیٰ نہج پر بیان کرنا ان کے اشعار کا خاصہ ہے، مثال کے طور پر فرمایا؛

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لیے ہے
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

محمد علی جوہر زندگی بھر اپنے ان اشعار کی تفسیر رہے۔ بالآخر ملازمت ترک کر کے آپ باضابطہ صحافت سے وابستہ ہوئے اور 14 جنوری 1904 کو کامریڈ کا اجراء ہوا۔ مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ کامریڈ پڑھنا اس وقت فیشن میں داخل تھا، انگریز تک کامریڈ کی انگریزی پر مسحور ہو کر سر دھنتے تھے۔ اس پر تکیہ نہ کر کے مولانا نے 23 فروری 1913 کو **ہمدرد** کا اجراء کیا اور اردو صحافت کو ایک نئی بلندی پر لے گئے۔ معیار طباعت کے خاص خیال کے ساتھ ساتھ اپنے صحافتی مشن کے بارے میں بھی وہ کافی متفکر تھے۔ چنانچہ خود مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں؛ ''مجھے ایڈیٹری کرنا نہیں ہے، تبلیغ مدنظر تھی۔'' لیکن ان اخبارات کی مقبولیت، مولانا کی بیباک تنقید اور جرأت آمیز تحریر حکومت کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی اور متعدد بار کامریڈ اور ہمدرد پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ 1928 تک 'بے قاعدگی' سے صحافت کے میدان سے وابستہ رہنے کے بعد مولانا محمد علی جوہر مکمل طور پر سیاسی سرگرمیوں میں منہمک ہو گئے۔

فراست، سیاست، قیادت: 1913 میں کانپور کی مسجد کے ایک حصے کو حکومت نے شہید کر دیا جس کے خلاف (مقامی حکام کی سردمہری پر) مولانا محمد علی جوہر نے انگلینڈ کی پارلیمنٹ پہنچ کر احتجاج کیا اور اس حصے کی دوبارہ تعمیر کرا کے ہی دم لیا۔ مولانا اپنی انہی 'حرکتوں' کی وجہ سے متعدد دفعہ جیل گئے، لیکن حکومت کی جانب سے کی گئی صلح وصفائی کی ہر کوشش کو انھوں نے حقارت سے ٹھوکر ماردی۔

خلافت تحریک کی کامیابی اور ہندوستان کے ہندو و مسلمانوں کے باہمی اتحاد میں ان کے عظیم رول کو مورخ کبھی نظر انداز نہیں کرسکتا۔ خلافت، پھر چاہے کیسی ہی گئی گزری کیوں نہ ہو اس کی بقاء اتحاد عالم اسلامی کے لیے ضروری تھی، اس کا اندازہ انھیں پہلے ہی ہو گیا تھا۔ خلافت کا خاتمہ برطانوی استعمار کو خلیجی ممالک تک وسیع کر دیتا لہٰذا اس مسئلے پر انھوں پورے ملک میں ایک برقی رو دوڑا دی۔ انگریزوں کو سبق سکھانے کے لیے ترکِ موالات کی تحریک شروع کی، گاندھی، تلک اور موتی لال نہرو جیسے سرکردہ لیڈران کے ساتھ ایک متحدہ محاذ قائم کیا۔ یہی تحریک آگے چل کر **تحریک عدم تعاون** کے قالب میں ڈھل گئی، جس نے انگریزی اقتدار کی چولیں ہلا ڈالیں۔ سچ تو یہ ہے کہ محمد علی جوہر اور ان کے بھائی شوکت علی نے گاندھی جی کی کل ہند اہمیت بڑھا دی۔ محمد علی جوہر گاندھی کی فراست کے قائل تھے، لہٰذا انھیں امید تھی کہ گاندھی جی اسلام قبول کرلیں گے؛ انھوں نے جواہر لال نہرو سے کہا بھی تھا کہ گاندھی نے قرآن کا مطالعہ کیا ہے اور وہ اسلام کی حقانیت کے قائل ہیں لیکن محض خود بینی اور سیاست کی وجہ سے اس کا اعلان نہیں کرسکتے۔ مولانا محمد علی جوہر کی شمولیت اور ان کی تحریک خلافت سے پہلے انڈین نیشنل کانگریس، ہوسکتا ہے انڈین رہی ہو، لیکن نیشنل تو ہرگز نہیں تھی۔ کانگریس میں محض کچھ خوش وضع، عافیت پسند اور اونچے طبقے کے لوگ تھے۔ ان کا کام صرف یہ تھا کہ سال میں ایک جگہ جمع ہوں شاندار تقریریں کریں، قرار دادیں پاس ہوں اور پھر اگلے سال تک کی چھٹی۔ خلافت تحریک نے ہندو مسلم اتحاد اور آزادی کی امنگ اور ملکی بیداری کا وہ سماں پیدا کیا کہ انگریز ایک متوقع 1857 کے خدشے سے پریشان ہو گئے۔ تحریک کا سارا خرچ خلافت کے فنڈ سے پورا ہوتا تھا، خود گاندھی اور دیگر ہندو لیڈران کے دورے بھی خلافت کمیٹی کے سرمائے سے ہوتے تھے۔

محمد علی جوہر کا عقیدہ تھا کہ مسلمان تعلیم چھوڑ سکتے ہیں لیکن مذہب نہیں۔ اے ایم او کالج (بعد کی علی گڑھ یونیورسٹی) کو برطانوی امداد ملتی تھی لہٰذا آپ نے دلی میں قومی سرمایہ سے اکتوبر 1920 میں **جامعہ ملیہ اسلامیہ** کے قیام میں اہم کردار نبھایا۔ جامعہ کے مقاصد کے بارے میں آپ کہتے ہیں کہ اس کا پہلا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو حق دوست و خدا پرست مسلمان بنایا جائے اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ ان کو وطن دوست و حریت پرور ہندوستانی بنایا جائے۔

مولانا محمد علی جوہر 14 دسمبر 1921 کو مدراس میں گرفتار کر لیے گئے، انھوں نے تحریک خلافت کے

دوران جگہ جگہ کہا تھا مسلمانوں پر انگریزی فوج میں کام کرنا حرام ہے، لہٰذا ان پر فوج میں بغاوت پھیلانے کا الزام لگا۔ معرکۂ عدالت میں انھوں نے خوب دادِ شجاعت دی۔ مقدمے کے دوران جج کے سامنے ان کی پامردی اور مدلل بیانات کافی مقبول ہوئے۔ انھوں نے جج سے مخاطب ہو کر کہا، **''اگر خداکا قانون برطانوی حکومت کے قانون سے متصادم ہوگا۔ تو میں خداکے قانون کا فرمان بردار رہوں گا، برطانوی قانون کو نظر انداز کروں گا۔''** یوں عدالت میں بانگ دہل اپنے 'جرم' کا اعتراف کر کے انھوں نے اپنی اسلامی حمیت اور کردار کی مضبوطی کا ایک اور ثبوت بہم پہنچایا۔ انہی کا شعر ہے:

ہم کو خود شوق شہادت ہے گواہی کیسی؟
فیصلہ کر بھی چکو مجرمِ اقراری کا

اس مجرمِ اقراری کو دو سال قید کی سزا ہوئی۔ اگست 1923 میں آپ جیل سے رہا ہوئے۔ اور اسی سال بالاتفاق کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ جواہرلال نہرو ان کے سکریٹری بنے۔ لیکن اب ملک کی سیاسی فضا بالکل بدل چکی تھی۔ خلافت تحریک کے دوران جو ہندو مسلم اتحاد دیکھنے میں آیا تھا وہ اب قصۂ پارینہ بن چکا تھا۔ جگہ جگہ ہندو مسلم فسادات ہو رہے تھے۔ عوام میں ایک عام سی بددلی پھیل چکی تھی۔ اس دوران دسمبر 1926 میں سوامی شردھانند کو رنگیلا رسول لکھنے کی پاداش میں کسی مسلمان نے قتل کر دیا۔ اسلام پر چہار طرفہ حملے ہونے لگے کہ یہ جہادیوں کا مذہب ہے، تلوار کے ذریعے پھیلا ہے اور غیر مسلموں کو قتل کرنا ہی ان کا جہاد اور ان کی عبادت ہے۔ محمد علی جوہر نے جمعہ کے دن جامع مسجد کے منبر سے مسلمانوں کو للکارا، ''کاش کوئی شخص اسلام کے خلاف ان افترا پردازیوں کا جواب دلائل و براہین کے ساتھ قلمبند کرے اور دنیا کے سامنے اسلامی نظریۂ جہاد کی حقیقت آشکارا کر سکے''۔ محمد علی جوہر کی یہ پکار رائیگاں نہیں گئی۔ ان کا خطاب سننے والے ایک نوجوان نے یہ عظیم کارنامہ انجام دیا۔ تاریخ اس نوجوان کو مولانا مودودی کے نام سے جانتی ہے۔

مولانا محمد علی جوہر ہندوستان کی آزادی کے لیے ہندو مسلم اتحاد کو ناگزیر سمجھتے تھے۔ 1927 کے شروع میں ہندو مسلم اتحاد کے لیے ایک آل پارٹی کانفرنس منعقد کی گئی جو ناکام ہوئی۔ اس ناکامی پر مولانا محمد علی نے یہ تدبیر کی کہ مسلمان چند باتوں پر خود متفق ہو جائیں اور پھر ان باتوں کو کانگریس سے منوالیا

جائے اور یوں اتحاد کے اس مقصد کو حاصل کیا جائے۔ چنانچہ 20اپریل 1927 کو ایسا ایک جلسہ دہلی میں منعقد کیا گیا۔اس جلسے میں جن تجویزوں سے اتفاق ہوااسے مولانا نے کانگریس سے بھی منوالیا اور یوں اتحاد کے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا۔اگرانہی بنیادوں پر ملک کی سیاست کی گاڑی آگے بڑھائی جاتی تو تقسیم کے سانحے سے بچا جاسکتا تھا۔لیکن خلافت اور تحریک عدم تعاون کے ختم ہونے کے بعد ہندو اور مسلمانوں میں جو خلیج پیدا ہوئی (یا کی گئی) وہ پھر کبھی پاٹی نہ جاسکی۔فرقہ پرستی کا یہ ناسور 'مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی' کے مصداق پھیلتا گیا اور آج مکمل کینسر بن چکا ہے۔مولانا محمد علی جوہر چاہتے تھے کہ ایک ایسے دستوری خاکے پر سارے ہندوستانیوں کا اتفاق ہوجائے جس میں جمہوریت کا قیام ضرور ہولیکن ہر مذہب،اس کے قوانین،اوراس کے مفادات کا تحفظ بھی دستوری ہو۔

1928 میں کانگریس نے نہرو رپورٹ منظور کرلی۔اس میں ہندوستان کے لیے مکمل آزادی کے بدلے درجۂ مستعمرات (Dominion Status) کی مانگ تھی۔مولانا محمد علی جوہر نہرو رپورٹ کے خلاف تھے،وہ مکمل آزادی سے کم کسی بات پر راضی نہ تھے۔ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے خداوند کریم اور انگریزی جاسوس کو حاضر و ناظر جان کر کہا:''میرا دل و دماغ سب کچھ کانگریسی ہے،لیکن میں پھر کہتا ہوں اور سب لوگ سمجھ لیں کہ اسلام دین فطرت ہے اور جو اس سے ذرہ برابر بھی ہٹا وہ گمراہ ہوا،اس میں کسی کی تخصیص نہیں۔مجھ کو نہرو رپورٹ سے غرض نہیں،وہ صحیح ہو یا غلط، لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اور آپ اچھی طرح سن لیں کہ میں انگریزی حکومت کو پسند نہیں کرتا، میں ہرگز اس بات پر راضی نہیں کہ انگریز کا غلام بنوں،یہ خلافِ اسلام ہے۔''

کلکتہ میں نہرو رپورٹ پر غور کرنے کے لیے منعقدہ آل پارٹی کنوینشن میں آپ شریک ہوئے اور ڈومینین اسٹیٹس کے خلاف تقریر کرتے ہوئے کہا کہ جولوگ کامل آزادی کے مخالف اور درجۂ مستعمرات کے حامی ہیں،وہ ملک کے بہادر فرزند نہیں ہیں بلکہ بزدل ہیں۔اس پر اتنا ہنگامہ ہوا کہ آپ تقریر ختم نہیں کرپائے اور بیٹھنا پڑا۔کانگریس اس وقت تک ملک گیر تنظیم بن چکی تھی،اب اسے محمد علی کی ضرورت نہیں تھی،یوں دھیرے دھیرے وہ کانگریس سے دور ہوتے چلے گئے۔حالانکہ جو بات انھوں نے درجۂ مستعمرات کے خلاف کہی تھی وہ کانگریس کو اگلے ہی سال ماننی پڑی اور نہرو رپورٹ کو رد کردیا گیا۔

عمر بھر کی لڑائی: زندگی بھر محمد علی اپنوں سے، غیروں سے لڑتے رہے۔ 25-1924 میں جب حجاز میں ابن سعود اور شریف حسین کے درمیان لڑائی چھڑ گئی تو شریف حسین کے مظالم اور ابن سعود کے اس وعدے پر کہ حجاز کو شریف حسین سے پاک کرنے کے بعد وہ ایک شرعی جمہوریت کا قیام کریں گے، مولانا جوہر نے ابن سعود کا ساتھ دیا۔ یہ ان کے لیے بڑی آزمائش کا وقت تھا کیونکہ ان کے پیر و مرشد عبدالباری فرنگی محلی ابن سعود کے خلاف ہو گئے تھے۔ مولانا نے اپنے مرشد کے عزت و احترام میں کوئی کمی نہیں کی، لیکن ابن سعود کا ساتھ بھی نہیں چھوڑا۔ بعد میں جب ابن سعود نے حجاز میں اپنی بادشاہت قائم کر لی تو مولانا محمد علی جوہر نے اس وعدہ فراموشی پر خوب ہائے واویلا مچایا، البتہ ان کے دوست مولانا ظفر علی خان کھل کر ابن سعود کی حمایت میں سامنے آئے۔ مرشد کے بعد انھیں اب دوست سے 'جنگ' لڑنی پڑی۔ 1926 میں حج کے موقع سے حجاز میں **موتمر اسلامی** منعقد کی گئی، اس میں آپ شریک ہوئے اور حجاز میں ابن سعود کی بادشاہت کے بدلے ایک شرعی جمہوریت کے قیام کی جی توڑ کوششیں کیں۔ سعودی حکومت نے حجاز میں موجود مآثر اسلامی کے انہدام کی جو کارروائی شروع کر رکھی تھی، آپ اس کے خلاف بھی جم کر برسے۔ ان کی باتوں کا جب وہاں کے حکمرانوں پر کوئی اثر نہ ہوا تو اگست میں واپسی پر آپ نے آخری چارۂ کار کے طور پر فرمایا کہ اگر سعودی حکومت کے لوگ راستے پر نہ آئے تو عالم اسلام کے مسلمان حج کے لیے نہ جائیں، تاکہ حکومت پر مالی بار پڑے اور وہ مسلمانانِ عالم کی خواہشات کو نظر انداز نہ کرے۔ مولانا کی اس تدبیر کو کچھ گروہوں نے اسلام کے بنیادی عقیدہ میں رخنہ اندازی کے معنی پہنائے اور ان کے خلاف ایک نیا طوفان کھڑا کر دیا۔

1929 میں سارد اایکٹ کے پاس کرانے کی کوششیں تیز ہو گئیں، جس کی رو سے ایک مخصوص عمر سے پہلے شادیاں ممنوع اور خلافِ قانون قرار پاتیں۔ ہندوؤں سے بہت اتحاد تھا لیکن محمد علی انھیں خوب کھری کھری بھی سناتے تھے چنانچہ آپ نے اس بل کی پرزور مخالفت کی یا کم از کم مسلمانوں کو مستثنیٰ رکھنے کی مانگ کی، کیونکہ جس طرح حرام کو حلال نہیں کیا جاسکتا اسی طرح حلال کو حرام بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس پر لارڈ اِروِن سے بھی تکرار رہی۔

اسی طرح جب **جمعیت العلماء** مکمل طور پر کانگریس کی حامی ہو گئی تو محمد علی، جو جمعیت کو سیاست میں اور کانگریس کے قریب لانے میں اہم تھے، انھوں نے اس کی مخالفت شروع کی کیونکہ اب ان کے

نزدیک کانگریس کے نظریات میں مسلمانوں کے تعلق سے تبدیلی آچکی تھی۔

مسلسل اضطراب سے مکمل آرام تک: اس دوران مولانا جوہر کی صحت بہت گرگئی تھی۔ لیکن باوجود ہزار خرابیٔ صحت کے مولانا نے نومبر 1930 کو لندن میں منعقدہ گول میز کانفرنس میں شرکت کا من بنالیا۔ وہ ذیابطیس کے پرانے مریض تھے۔ جس وقت گول میز کانفرنس کے سفر کے لیے تیار ہوئے تو اس وقت پیر میں گینگرین ہوگیا تھا، پاؤں سے حس ختم ہوگئی تھی۔ کسی بھی وقت پیر کاٹنے کی نوبت آسکتی تھی۔ آنکھیں بھی کمزور ہوگئی تھیں۔ جون 1930 میں شملہ کے اسپتال میں داخل ہوئے لیکن لندن جانے کا پروگرام ملتوی نہ کیا۔ وہ ممبئی میں جہاز پر اسٹریچر پر لٹا کر سوار کیے گئے، فرانس پہنچتے پہنچتے ان کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو پیرس میں اتار لیے گئے۔ خون کا دباؤ بڑھ گیا اور تنفس میں بھی دشواری ہونے لگی۔ قلب وجگر سے لے کر جسم کا ہر ہر نظام درہم برہم ہونے لگا۔ بیماریوں کے اس طومار کے باوجود آپ نے کانفرنس میں شرکت کی اور بیٹھ کر ہی سہی لیکن ایک لمبی چوڑی تقریر کی۔ انھوں نے اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں حاضرین کو اپنی بیماری کی تفصیلات بتائیں اور کہا کہ ان امراض کے ساتھ وہ سات ہزار میل کا بری و بحری سفر طے کرکے، اور لوگوں کا یہ الزام اپنے سر لے کر آئے ہیں کہ وہ اپنے ملک سے غداری کر کے حکومت کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے زور دیتے ہوئے کہا کہ میں شیطان کے ساتھ بھی مل کر کام کرسکتا ہوں، بشرطیکہ خدا کی راہ میں کام کرتا ہو۔ ان تمام رکاوٹوں کے باوجود وہ یہاں تک کیوں آئے اس کا سبب انھوں نے یوں دہاڑ کر بتایا؛ ”آج میں جس مقصد سے یہاں آیا ہوں وہ یہ ہے کہ میں اپنے ملک کو اسی حالت میں واپس جاسکتا ہوں جب کہ میرے ہاتھ میں آزادی کا پروانہ ہوگا، ورنہ میں ایک غلام ملک میں واپس نہیں جاؤں گا۔“

اپنی تقریر اور کانفرنس کی نشستوں کے علاوہ بھی آپ چین سے بیٹھے نہ رہے بلکہ مسائل کو حل کرنے کی اپنی سی کوششوں میں لگے رہے۔ رات دن ٹیلی فون پر لگے رہتے۔ کبھی ٹائمز کے فارن ایڈیٹر سے کبھی اسپیکٹیٹر کے ایڈیٹر سے، کبھی برنارڈ شا سے، کبھی وزیر ہند سے ملتے اور اپنا موقف بیان کرتے، صرف ڈائیلاگ کے قائل نہ تھے چنانچہ عملی تجاویز پیش کرتے۔

اس اثنا میں طبیعت اور زیادہ خراب ہوگئی۔ 23 دسمبر کو بے ہوشی طاری ہوگئی جو دو دن تک دراز ہوگئی ایسا لگا کہ بس اب آخری وقت آلگا ہے لیکن پھر اچانک ہوش آگیا؛ ہوش آتے ہی ایک انگریز وزیر سے

ہندو مسلم مسئلے کی نزاکت پر بات کرنے چلے گئے۔ یکم جنوری 1931 کو انگلستان کے وزیر اعظم کو ایک طویل خط لکھا اور آزادی و ہندو مسلم مسئلے کے منصفانہ حل کے تعلق سے اپنی گزارشات پیش کیں۔
انگریز بھلا ہندوستان کو آزادی کہاں دینے والے تھے، لیکن قدرت نے مولانا کی زبان کی آبرو رکھ لی اور لندن کے ہی ہائیڈ ہوٹل پارک میں مولانا محمد علی جوہر نے 4 جنوری 1931 کو آخری سانسیں لیں۔
فلسطین کے مفتیٔ اعظم جناب امین الحسینی نے درخواست کی کہ اس نابغۂ روزگار شخصیت کی تدفین بیت المقدس میں کی جائے، چنانچہ بیت المقدس کی مقدس سرزمین ہی ان کی آخری پناہ گاہ قرار پائی۔ عالم اسلام کے کونے کونے سے تقریباً دو لاکھ سے زائد افراد نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔ اللہ تعالیٰ اس مجاہد کی قبر کو نور سے بھر دے، جس نے فخریہ کہا تھا؛

عقل کو ہم نے کیا نذر جنوں
عمر بھر میں یہی دانائی کی

آمین!